شخصیات :

اقبالؒ اور مسعود سعد سلمان

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبال آگیا کیونکر

میسّر میر و سلطاں کو نہیں شاہینِ کافوری!

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حضرت علامہ کی مختلف شعری و نثری تصانیف و تالیفات اس بات کی شاہد عادل ہیں کہ علامہ کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا۔ نچہ یہ اسی وسعتِ مطالعہ کا سبب ہے کہ ہمیں ان کے کلام میں جگہ جگہ ادبی، سیاسی اور مذہبی شخصیات کا ذکر کار فرما نظر ہے۔ ایسی کسی بھی شخصیت کا ذکر علامہ محض زیبِ داستاں، تفنّنِ طبع یا شعر گوئی کی خاطر نہیں کرتے بلکہ اس کا محرک جذبہ ہوتا ہے جو ان میں متعلقہ شخصیت کے کسی خاص پہلو سے متاثر ہونے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ فارسی زبان و ادب سے ہ کو عشق تھا جس کا اظہار ان کے فارسی کلام کی کثرت کی صورت میں نظر آتا ہے لہٰذا اس زبان کی ادبی شخصیات سے ان سی نہ کسی رنگ میں متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ ان کے کلام میں بہت سے فارسی گو شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ کہیں ں نے کسی شاعر کے شعر پر تضمین کی ہے تو کہیں کسی کے اشعار کا ترجمہ کر دیا ہے۔ انہی فارسی شعرا میں ایک مسعود بن د بن سلمان بھی ہے جس کی درج ذیل رباعی کو علامہ نے اردو کا جامہ پہنا کر اس پر تضمین کی ہے:

باہمتِ باز باش و با کبرِ پلنگ
زیبا بگہِ شکار و پیروز بجنگ
کم کن بر عندلیب و طاؤس درنگ
کآنجا ہمہ بانگ آمد و اینجا ہمہ رنگ[1]

علامہ کا ترجمہ و تضمین ملاحظہ ہو:

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ[2] خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لیے تنگ

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ[۲]

مسعود سعد سلمان کا شمار پانچویں، چھٹی صدی ہجری / گیارھویں بارھویں عیسوی کے عظیم قصیدہ گو فارسی شعراء میں ہوتا ہے۔ اسے ایک بدقسمت انسان کہا جا سکتا ہے کہ اس کی عمرِ عزیز کا ایک حصہ کوئی ۱۸، ۱۹ برس حاسدوں کی لگائی بجھائی کے باعث قید و بند میں گزرا۔ خود اس کا تعلق تو لاہور سے تھا کہ یہیں پیدا ہوا تھا لیکن اس کے آبا و اجداد ہمدان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ اس کا والد سعد، غزنوی بادشاہ امیر مجدود بن مسعود کے ہمراہ مستوفی کی حیثیت سے ۴۲۷ھ / ۱۰۳۶ء میں برصغیر پاک و ہند وارد ہوا اور یہیں کا ہو رہا۔ مسعود کی ولادت یہیں ۴۳۸ - ۴۴۰ھ / ۱۰۴۶ - ۴۹ء کے درمیان ہوئی۔ سنِ رشد کو پہنچا تو سلطان ابراہیم غزنوی کے دربار میں اسے رسائی ملی۔ ۴۶۹ھ / ۱۰۷۷ء میں جب سیف الدولہ محمود بن ابراہیم کو دربارِ غزنی کی طرف سے برصغیر کا والی بنایا گیا تو مسعود ایک ندیم کی حیثیت سے اس کے ساتھ برصغیر آیا۔ اسے مختلف جنگوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ وہ چند ایک بڑے امرا میں شمار ہوتا تھا اور اسی بنا پر کئی ایک شعرا کا ممدوح تھا۔

۴۸۰ھ / ۱۰۸۷ء کے لگ بھگ سیف الدولہ محمود کو بوجوہ، اس کے باپ نے قید میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ اس کے ندیم بھی دھر لیے گئے۔ چنانچہ مسعود کو بھی حبس میں ڈال دیا گیا جو بدقسمتی سے ان دنوں اپنی املاک پر بعض غاصبوں کی دست درازی کے خلاف شکایت لے کر غزنی گیا ہوا تھا۔ سات برس تک سو اور دہک کے قلعوں میں اور تین برس تک قلعہ نای میں وہ قیدی کی حیثیت سے رہا۔ اس دوران میں اسے بڑے آلام و مصائب کا سامنا رہا۔ جس کا ذکر اس کے اکثر اشعار میں نظر آتا ہے۔ آخر ایک مقرب کی سفارش پر اس کی رہائی عمل میں آئی اور وہ لاہور میں اپنی املاک پر واپس آ گیا۔

۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء میں ابراہیم غزنوی فوت ہوا تو اس کا بیٹا سلطان مسعود تخت پر بیٹھا۔ اس نے برصغیر پاکستان و ہند کی حکومت اپنے بیٹے امیر عضد الدولہ شیرزاد کو سونپی۔ امیر مذکور کے سپہ سالار ابونصر پارسی کی سفارش پر مسعود کو جالندھر کا حاکم بنا دیا گیا۔ بدقسمتی نے اسے پھر آ پکڑا۔ ابونصر کسی وجہ سے سلطان کا معتوب ٹھہرا اور اسے قید کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دوست، احباب اور عمال بھی عتاب کا نشانہ بنے اور یوں مسعود ایک مرتبہ پھر معزول کر دیا گیا۔ اس کی املاک پر غاصبانہ قبضہ ہوا اور آخر سلطان کے حکم سے وہ مرینج میں محبوس ہوا۔ یہاں آٹھ برس کے بعد ۵۰۰ھ / ۱۱۰۷ء میں کسی کی سفارش پر اس کی رہائی ہوئی۔ ازاں بعد وہ سلطان مسعود غزنوی، عضد الدولہ شیرزاد، ملک ارسلان اور بہرام شاہ کا لابُد یرین رہا۔ اس عرصے میں اس نے ان لوگوں کی مدح میں قصیدے بھی کہے۔ اس کی وفات ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء میں ہوئی۔

---

(۲)

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مسعود کا شمار بڑے امرا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ ان باتوں کے باعث وہ بڑے بڑے لوگوں کی توجہ کا بھی مرکز تھا اور اس کے معاصر شعرائے بزرگ بھی اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان شعرا میں حکیم سنائی غزنوی، حسن غزنوی، امیر معزی اور ابوالفرج رُونی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق سنائی نے مسعود کا دیوان ترتیب دیا تھا۔ مسعود کو نثر اور نظم دونوں میں کمال مہارت حاصل تھی۔ اس کا اسے خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

بنظم و نثر کسے را گر افتخار بود
مرا سزاست کہ امروز نظم و نثر مراست[6]

وہ بنیادی طور پر "سبکِ خراسانی" کا شاعر ہے۔ اس کی جن منظومات نے اسے انفرادیت بخشی ہے وہ اس کی حبسیات ہیں (یعنی وہ اشعار جو اس نے دورانِ قید کہے)۔ فارسی شاعری میں حبسیات کا وجود (بجز مسعود کے یہاں) کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ بلند مرتبے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حساس شاعر بھی تھا۔ اس قید و بند نے اس کے حساس دل کو مزید سوز و تپش کی آماجگاہ بنا دیا۔ جس کے نتیجے میں اس کے اس دوران میں کہے گئے اشعار ایک خاص تاثیر اور سوز و درد کے حامل ہیں۔ چہار مقالہ کے مصنف نظامی عروضی سمرقندی نے اس کے ان اشعار پر مختصر لیکن جامع اور زبردست رائے دی ہے۔ وہ اس کے ذکر میں ایک جگہ کہتا ہے:

"اربابِ خرد و اصحابِ انصاف دانند کہ حبسیات مسعود در علو بچہ درجہ است و در فصاحت بچہ پایہ بود۔ وقت باشد کہ من از اشعارِ او ہمی خوانم، موی بر اندامِ من بر پای خیزد و جای آں بود کہ آب از چشم من برود"[7]

ترجمہ: ــــــ

اربابِ خرد اور اصحابِ انصاف جانتے ہیں کہ مسعود کے حبسیات بلندی میں کس درجہ پہ ہیں اور فصاحت میں ان کا کیا مرتبہ ہے۔ میں جب کبھی اس کے اشعار پڑھتا ہوں تو میرا رُواں رُواں کانپ اٹھتا ہے اور میری آنکھوں سے آنسو امڈ پڑتے ہیں۔

کلامِ مسعود کے مطالعے سے اس کا جو کردار ہمارے سامنے آتا ہے، اس کے مطابق وہ صحیح معنوں میں اقبال کا مردِ مومن تھا۔ وہ بہت بڑا صاحبِ مرتبہ تھا۔ اس نے جنگوں میں شرکت کی، کفار سے لڑا۔ بلا جواز و سبب بے پناہ رنج و محن کا شکار رہا لیکن ان تمام باتوں کے باوصف اس نے ہمت نہ ہاری۔ اپنی بے گناہی کے باعث وہ شکوہ و شکایت زبان پہ لایا تو سہی لیکن اس میں بھی اسے اپنے وقار کا احساس رہا۔ اس کے اکثر اشعار سے اس کی جفاکوشی، جوانمردی اور زبردست ہمت

IqbalCyberLibrary
All rights reserved
©2002-2006

کا پتا چلتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو بھی ان صلاحیتوں سے خود کو آراستہ کرنے کا درس دیتا ہے۔ اسے ہم اس کی شاعری کا تابناک پہلو قرار دے سکتے ہیں اور اس کا یہی وہ تابناک پہلو ہے جس سے حضرت علامہ بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کی مذکورہ رباعی سے استفادہ کیا۔

اس کی شروع کی زندگی جس ٹھاٹھ سے گزری ہے اس کا ذکر اس نے ایک قطعے میں کیا ہے۔ یہ زندگی سراسر ناؤ نوش کی زندگی تھی جس میں ساقیانِ ماہ وش اور سرو قدانِ سیم تن چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سادہ زبان میں کہا گیا یہ قطعہ اسی کی زبان میں ملاحظہ ہو:

ای بسا شب کہ تا بروزِ سپید
متعجب زمن بماند اختر
بر چپ و راست سیلما راندم
بقدح ز آں گداختہ گوہر
با رُخ و زلفِ ساقیانِ ماہ
یاد نامد ز لالہ و عبہر
بہم آمیختہ شد اندر گوش
نوشِ ساقی و عن خنیاگر
ساغرِ می شدہ برنگ و ببوی
چشم را شمع و مغز را مجمر
یک زماں شد بیکدگر گفتیم
چوں بدیدیم ، روی یکدیگر
تن ز مستی ہمی نپاید پای
دل ز شادی ہمی بر آرد پر[۸]

جس شخص کی زندگی اس ڈگر پر گزری ہو اس پر اچانک رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں، اس کے درد و غم کی شدت کا اندازہ کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس نے اپنی اس زندگی کی جگہ جگہ عکاسی کی ہے جو اس کے قاری پر اپنا تاثر چھوڑے بغیر نہیں رہتی۔ یہاں اس کے چند قصائد و قطعات کے حوالے سے اس کی مذکورہ زندگی کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک قطعہ میں اس نے اپنی مسلسل قید کی زندگی، اس دوران میں اٹھائے جانے والے دُکھ اور اس موقع پر اپنوں کی

بے توجہی و بیگانگی کا ذکر کیا اور آخر میں کہا ہے کہ اگر میں اپنے اوپر وارده ان حالات و مصائب کا ذکر کسی اور سے سُنتا تو مجھے یہ سب کچھ افسانے کی طرح جھوٹ معلوم ہوتا۔ گویا اس ایک شعر میں مسعود نے ساری داستانِ الم بیان کر دی ہے۔ پھر شروع میں "تبارک اللہ" کا استعمال بھی، جس میں طنز ہے، اس کی بے بسی کی عکاسی کرتا ہے ۔ اسی طرح دوسرے شعر کی تشبیہات بھی اس کے انتہائے اندوہ کی نشاندہی کرتی ہیں:

تبارک اللہ ازیں بخت و زندگانی بیں
کہ تا بسیرم زندان بود مرا خانہ
چو شانہ شد جگرم شاخ شاخ از اندہ آن
کہ موی دیدم شاخی سپید در شانہ
من از کہ دارم امروز امیدِ مہر و وفا
کہ دوست دشمن گشتہ است و خویش بیگانہ
اگر شنیدمی از دیگراں حکایتِ خویش
ہمہ دروغ نمودی مرا چو افسانہ [۹]

غالب نے کہا تھا:

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب! کئی دیے ہوتے [۱۰]

مسعود نے غموں کی تفصیل بیان نہیں کرتا بلکہ عمومی انداز میں کہتا ہے کہ کوئی بھی دُکھ ایسا نہیں جو میرا مقدر نہیں بنا۔ وہ ان غموں اور دکھوں کی آمد کو خوشخبری قرار دیتا ہے، شاید اس بنا پر کہ بقول غالب:

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

آلام کی کثرت و شدت کو اس نے ایک انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق اگر غموں کو عمر قرار دے لیا جائے تو اس حساب سے اسے گویا عمرِ جاوید حاصل ہو جاتی۔ اس کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل دکھوں کے سبب پیچ و تاب میں اور لرزتے کانپتے گزرا ہے۔ آئے دن کے ان حادثات نے اسے اس حد تک مایوس کر دیا ہے کہ اسے اپنے دن پھرنے کی قطعاً کوئی امید نہیں رہی۔ اس کی اس حالت کے بارے میں پھر غالب ہی کی زبان میں بات کرنا پڑے گی کہ:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے [۱۱]

ایک عالی مرتبہ امیر جس کی زندگی کبھی ناز و نعمت میں گزری ہے، اس حالت سے دوچار ہو جائے کہ چاند اس کے لیے

چراغ اور سورج آگ کا کام دے۔ یقیناً ایک بہت بڑا المیہ ہے اور اس المیے سے دوچار ہو کر اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنا بلاشبہ اس کی غیر معمولی ہمت و استقامت اور حوصلہ و صبر کا غماز ہے:

کدام رنج کہ آن مر مرا انگشت نصیب
کدام غم کہ بدان مر مرا نبود نوید
اگر غم دلِ من جملہ عُسری بودی
بگیتی اندر بے شک بماندی جاوید
ہمی بہ پیچم از رنجِ دل چو شوشۂ زر
ہمی بلرزم بر خویشتن چو شاخک بید
امید نیست مرا گر کسی امید بود
امید منقطع و منقطع امید امید
بگو چگونہ بود حالِ من کہ در شب و روز
چراغم از مہتابست و آتش از خورشید[12]

اسی طرح ایک اور قصیدے میں اس نے اپنی بے گناہی کا ذکر کرتے ہوئے بڑے پُردرد لہجے میں ان مصائب کی بات کی ہے جو اس پر ٹوٹ پڑے گئے۔ ان آلام کے باعث وہ اپنے دوستوں سے بھی محروم ہو گیا اور اس طرح تنہائی اور بے کسی کی زندگی اس پر مسلط ہو کر رہ گئی۔ اپنی اس حالت کو اس نے ایسے پرندے کی حالت سے تشبیہ دی ہے جس کی چونچ ابھی دانے تک نہ پہنچی ہو اور وہ جال میں پھنس گیا ہو۔ وہ جب حالتِ قید میں خود کو اور پھر اربابِ زنداں کو دیکھتا ہے تو شدتِ حیرانی میں سوچتا ہے کہ یہ کیسا چکر چل گیا۔ وہ چونکہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے اس لیے ایسی بے بسی کے عالم میں بھی وہ اپنے اس حبس کے لیے کوئی جواز ڈھونڈتا اور غالباً اس طرح دل کو اس حالت پر مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ میں خود کوئی گھٹیا اور احمق انسان ہوں، جو یوں میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔ لیکن اس کی یہ کیفیت جیسے عارضی سی ہو۔ کیونکہ وہ پھر جھرجھری لے کر اٹھ کھڑا ہوتا اور اسی حیرانی کا اظہار کرتا ہے کہ آخر میرا قصور کیا ہے؟ کیوں مجھے قید و بند میں ڈالا گیا ہے؟ میں کوئی چور نہیں، چور کا بھائی نہیں۔ نہ کبھی میں نے کوئی غلط قسم کا لقمہ کھایا ہے۔ پھر یہ سب کیا ہے؟

نظامی عروضی سمرقندی نے حبسیات کے بارے میں جن مذکورہ جذبات کا اظہار کیا ہے، مسعود کا کلام پڑھ کر اس کا قاری واقعی ایسا ہی محسوس کرتا ہے۔ اس نے اپنے دکھوں کے بیان میں دوستوں کے اس سے بے تعلق ہو جانے کا بھی بڑے کرب کے ساتھ ذکر کیا ہے جیسا کہ شروع میں بیان ہوا، مسعود سبک خراسانی کا شاعر ہے۔ اس دبستان کی ایک اہم خوبی سادگی و روانی ہے اور مسعود کے کلام میں یہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ فارسی زبان سے شغف رکھنے والا کوئی بھی قاری اسے

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

بآسانی سمجھ سکتا ہے:

شخصی بہزار غم گرفتارم
در ہر نفسی بجان رسد کارم
بی زلت و بی گناہ محبوسم
بی علت و بی سبب گرفتارم
در دام جفا شکستہ مرغی ام
بر دانہ نیوفتادہ منقارم
خوردہ قسم اختران بپاداشم
بستہ کمر آسمان بپیکارم
ہر سال بلای چرخ موسومم
ہر روز عنای دہر ادرارم
امروز بغم فزونترم از دی
و امسال بنقد کمتر از پارم
طومارِ نداشت طبعِ من
حرفیست ہر آنکشی ز طومارم
یارانِ گزیدہ داشتم روزی
امروز چہ شد کہ نیست کس یارم
زندان خدایگان کہ دمن کہ
ناگہ چہ قضا نمود دیدارم
بندیست گران بدست و پایم در
شاید کہ بس ابلہ و سبکسارم
محبوس چرا شدم نمی دانم
دانم کہ نہ دزدم و نہ عیارم
نز ہیچ عمل نوالہ ای خوردم
نز ہیچ قبالہ باقیی دارم[۱۳]

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اس کا قصیدہ بایں مطلع:

چرا نگرید چشم و چرا ننالد تن

کزیں برفت نشاط و زآں برفت وسن

بھی اس کی اس دردناک حالت کے بیان سے پُر ہے۔ اعزہ و اقربا، احباب اور وطن سے دُوری اس کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے۔ اس حالت میں جب وہ فریاد و فغاں کرتا ہے تو بڑے بڑوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ اس کی اس حالت پر کسی بھی دوست کو آنسو بہانے کی توفیق نہ ہوئی، اگر کسی نے ایسا کرنا بھی چاہا تو وہ دشمنوں کے خوف سے خاموش رہا۔ مسعود نے ایرانی تاریخ کی بعض تلمیحات کے حوالے سے اپنی اسی حالت کی عکاسی کرنا چاہی ہے۔ شاہنامہ فردوسی میں رستم کے بھانجے، بیژن کی داستانِ محبت بیان ہوئی ہے۔ اسے افراسیاب کی بیٹی منیژہ سے عشق کی پاداش میں دُور کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا تھا۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے اس نوجوان کے لیے وہاں دن اور رات برابر تھے۔ اس دوران میں اس نے بڑی ذلت اور ابتلا کی زندگی دیکھی۔ آخر رستم نے اسے نجات دلائی۔ مسعود کو بھی اسی قسم کی تاریکی اور کرب سے دوچار رہنا پڑا:

چناں بگریم کم دشمنان بخشایند

چو یادم آید از دوستان و اہلِ وطن

(جب مجھے دوست اور اہلِ وطن یاد آتے ہیں تو میں اس درد سے روتا ہوں کہ دشمنوں کو بھی مجھ پر رحم آجاتا ہے)۔

سپر شوم ز غم و پیرہن تن بدرم

ز بہر آنکہ نشان نیست بیراہن

ز رنج و ضعف بداں جایگہ رسید تنم

کہ راست ناید اگر در خطاب گویم من

صبور گشتم و دل در بہ آہنیں کردم

بخاست آتش ازیں دل چو آتش از آہن

بسانِ بیژن درماندہ ام بہ بند بلا

جہاں بمن بر تاریک چوں بچہ بیژن

نبود یارم از شرم دوستان گریان

نکرد یارم از بیم دشمناں شیون

All rights reserved. ©2002-2006

ز درد و اندہِ ہجراں گذشت بر من دوش
شبی سیاہ تر از زردی و رای اہریمن [۱۸]

۲

اس گرفتاری اور رنج و عذاب میں مبتلا ہونے سے قبل اس کی زندگی جس ڈگر پر گزر رہی تھی، اس کی ایک جھلک پہلے گزر چکی۔ وہ اس کی بزم تھی اور ممکن ہے اس کا تعلق صرف ایامِ شباب سے ہو اور بعد میں اس میں تبدیلی آگئی ہو۔ ذیل کے قطعہ میں اس نے اپنی زندگی کے دوسرے رخ یعنی رزم کی تصویر پیش کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ــــ اطیعوا اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم ــــ کی مجسم تصویر تھا۔ اس نے احکامِ خداوندی بجالانے میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ اپنے فرائض بخوبی انجام دیے۔ وہ واحد شاعر ہے جس کے یہاں ہمیں ذاتی طور پر جہاد میں شرکت کا ذکر ملتا ہے۔ وہ محض لڑائیوں یا جنگوں کی بات نہیں کرتا بلکہ تصریح کے ساتھ غزو (جنگ کردن در راہِ دیں [۱۹]) اور کفار کے الفاظ لاتا ہے۔ اس کے ایسے اشعار سے اس کے مجاہدانہ جوش و جذبہ کا پتا چلتا ہے۔ وہ بڑے دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ جب کبھی میں کفار سے ٹکر لیتا تو میری تلوار سے پھر کوئی بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ایک ایک حملے میں میں کئی کفار کو جہنم رسید کر دیتا۔ جیسا کہ اس نے خود کہا ہے، غالباً اس کی یہی خوبیاں اس کے لیے وبال بنیں کہ دشمن اور حاسد اس سے خار کھانے لگے۔

آغازِ گرفتاری کے موقع پر کہے گئے ان اشعار میں جہاں اس نے اپنی مذکورہ دینداری اور مردانگی وغیرہ کا ذکر کیا ہے، وہاں پاؤں میں بیڑیاں پڑنے کی عجیب توجیہ کی ہے۔ اس کے مطابق ہوا شاید اس کی تلوار کے زخم سے حلقہ (بیڑی) کی صورت اختیار کر گیا اور اب اس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے ہیں اور یوں اسے (مسعود کو) اب اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کے آرام کا خیال کرنا پڑ رہا ہے:

تا مرا بود بر ولایت دست
بودم ایزد پرست و شاہ پرست
امرِ شہ را و حکم اللہ را
نہ بدادم بہ ہیچ وقت از دست [۲۰]
دل بغزو و بشغل داشتمی !
دشمنان را ازان ہمی دل خست

چون بکاری نهادم روی
بس کس از تیغ من همی بنرست
بیکی حملهٔ من افتادی
خیل دشمن ز شش ہزار نشست
گر از زخم تیغ من آهن
حلقه گشت و ز زخمِ تیغ بجست
آمد اکنون دو پای من بگرفت
خویشتن در حمایتم پیوست
من کنون از برای راحتِ او
گه خفتن و بخاست و نشست[15]

اس کی مومنانہ سیرت کی جھلکیاں اس کے بعض دوسرے اشعار میں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک قصیدے میں اپنی بدنصیبی اور تکالیف کا ذکر کرتے ہوئے اس نے اپنے ظاہر و باطن کی یک رنگی و یکسانی کا بڑا زوردار دعویٰ کیا ہے جو سیرتِ مومن کی بنیادی خوبی ہے۔ اس کے اس دعوے میں تاثیر ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ مسعود نے یہ دعویٰ محض 'برائے شعر گفتن' نہیں کیا بلکہ یہ مبنی بر حقیقت ہوگا۔ اس قصیدے میں اس نے ایک قرآنی تلمیح کے حوالے سے قسمیہ انداز میں اپنی بے گناہی کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اپنی برأت ظاہر کرنے کے لیے شرطیہ لہجے سے کام لیا ہے جو اس کی پاک باطنی، راستی، راست بازی اور عالی ظرفی کا غماز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مجھ میں ذرہ بھر بھی کجی ہو تو میں اپنے باپ کی پشت سے نہیں ہوں گا۔

اس سے قبل اس نے شعر و ادب اور علم و فضل میں اپنی عظمت کا ذکر کیا ہے:

نی اہل مزاج و مسخرہ و رنجم
مرد سفر و عصا و انبانم
آنست ہمہ کہ شاعری قلم
دشوار سخن شدست آسانم
در سینہ کشیدہ عقل گفتارم
بر دیہ نہادہ قفل دیوانم
نقصان نکنم کہ در نحو بحرم
خالی نشوم کہ در ادب کانم

در غیبت و در حضور یکرویم
در اندہ و در سرور یکسانم
ایزد داند کہ ہست ہمچون ہم
در نیک و بد آشکار و پنہانم
واللہ کہ چو گرگ یوسفم واللہ
بر خیرہ ہمی نہمند بہتانم
گر ہرگز ذرّہ ای کثری باشد
در من، نہ ز پشت سعد سلمانم [۱۹]

ایک قطعے میں دنیا کے فانی ہونے، نیک فطرت مردوں کی حیاداری اور آسمان کی کینہ پروری کی بات کرکے وہ اپنی بعض کوتاہیوں سے نجات پا جانے پر شکرِ یزداں بجا لاتا ہے۔ وہ کبھی حرص و ہوس کا بندہ تھا۔ بادشاہوں کی مدح میں رطب اللسان رہتا تھا لیکن پھر یہ نوبت آئی کہ اس نے خدا کی طرف رجوع کیا، اس کی حمد و ثنا میں مصروف ہوا اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے لو لگائی۔ مسعود کا یہ احساس اور اس کا یہ پُرخلوص جذبہ ہمارے اس قول کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اقبال کا ایک مردِ مومن تھا:

طبعِ بیمارِ من ز بستر آز
شکرِ یزداں درست خاست کنون
در عتابِ قبیح خاطرِ توبہ
نوشداروی صدق خاست کنون
آن زبانی کہ مدحِ شاہاں گفت
مادحِ حضرتِ خداست کنون
لہجۂ پُر نوای خوش نغمت
بلبلِ باغِ مصطفیٰؐ ست کنون
مدتی مدحتِ شہاں کردم
نوبتِ خدمتِ خداست کنون [۲۰]

(۴)

معلوم ہوتا ہے شروع شروع میں اس پر اچانک قید و بند کا ردِ عمل شدید غم و اندوہ کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن

جیسے وہ جلد ہی سنبھل گیا اور اس کے اندر کا بلند ہمت، مصائب سے ٹکر لینے والا اور مومنانہ شان کا حامل انسان جاگ اٹھا۔ چنانچہ اس کے زیادہ تر قصائد و قطعات میں اس کی یہی شان نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں اس کا مطلع ذیل والا قصیدہ پیش کیا جا سکتا ہے:

نالم بدل چو نای من اندر حصار نای

پستی گرفت ہمت من زین بلند جای

اس قصیدے کے شروع میں اگرچہ اس نے اپنے رنج والم کا ذکر کیا ہے لیکن بعد میں جس جرأت و دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ وہ ان مصائب و آلام کو اپنے (اس کے) سر پر سوار رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ (اس کی سابقہ جاہ و حشم کی زندگی کو پیش نظر رکھیں تو) اس کی غیر معمولی ہمت و مردانگی اور غیرت و شجاعت کی نشاندہی کرتی ہے۔ ذرا لہجہ ملاحظہ ہو، کہتا ہے:

اے بے ہنر زمانے! تو مجھ کو بالکل مٹا کے رکھ دے اور اے کور دل (ظالم) فلک تو بھی مجھے پوری طرح پیس ڈال۔ اے زمانے! تو حسد کے باعث دن رات میرے راستے میں رنج والم کے بیسیوں کنوئیں کھود ڈال اور غم کی دسوں درزیں کھول دے۔ صبر و شکیب کی آگ میں مجھے گل کی طرح ڈال دے اور آزمائش و ابتلا کی کسوٹی پہ مجھے سونے کی طرح پرکھ۔ مجھے زخم لگانے کے لیے کبھی مجھے چاندی کی طرح پگھلا اور کبھی مجبوس کرنے کی خاطر سانپ کی طرح مجھ پہ افسوں کر۔ اے اژدہا نے فلک! میرا دل پوری طرح نگل جا اور اے آسمان کی چکی! مجھے پورے زور سے پیس ڈال۔ اے خوش بختی کی نگاہ! تاریک ہو جا اور مت دیکھ۔ اے امید کی ماں! تو بانجھ ہو جا اور کسی بھی امید کو جنم نہ دے۔

اس دعوتِ مبارزت میں اس کے پاس اپنے دفاع کے لیے سب سے بڑا ہتھیار صبر و قناعت ہے، جسے وہ ہر صورت میں تھامے رکھنا چاہتا اور دل کو بھی اس کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اس عارضی و فانی دنیا میں ان غم و آلام پر فریاد و فغاں کو کچھ بے ڈھب سی بات گردانتا ہے۔ اسی لیے اس سے ہر طور بچنا چاہتا ہے۔ قلعہ نای، جس میں وہ کئی برس مجبوس رہا، بلندی پر واقع تھا۔ مسعود نے مذکورہ لہجے سے پیشتر، اس بلندی کے حوالے سے خود کو بلند مرتبہ اور اپنی شاعری کو اس صورتحال میں وجہِ تسکین و راحت قرار دیا ہے:

گردون بدرد و رنج مرا کشتہ بود اگر

پیوندِ عمر من نشدی نظم جانفزای

نہ نہ زِ حصنِ نای ،بیفزود جاہِ من

داند جہاں کہ مادرِ فلکست حصن نای

من چون ملوک سر ز فلک بر گذاشتہ

زی زُہرہ بردہ دست و بمہ بر نہادہ پای

گر شیرِ شرزہ نیستی ای نفس کم شکر
ور مارِ گرزہ نیستی ای عقل کم گزای

ای بی ہنر زمانہ مرا پاک در نورد
وی کوردل سپہر مرا نیک برگرای

ای روزگار ہر شب و ہر روز از حسد
دہ چہ ز محنتم کن و دہ در ز غم گشای

ای تن جزع مکن کہ مجازیست این جہاں
وی دل غمین مشو کہ سپنجی ست این سرای

گر عز و ملک خواہی اندر جہاں مدار
جز صبر و جز قناعت دستور و رہنمای [۲۱]

وہ رنج والم میں بھی خوش وخرم رہنے کا درس دیتا ہے۔ اس کے مطابق ہر مصیبت کے سامنے پہاڑ بن کر ڈٹ جانا او ہوا کی طرح بے باک ہو جانا چاہیے۔ علامہ اقبال نے پیامِ مشرق [۲۲] کی ایک نظم "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" میں ایک ہرن کے حوالے سے خطرات و آلام سے ٹکر لینے کا جو درس دیا ہے وہی درس ہمیں مسعود کے یہاں براہِ راست ملتا ہے:

در محنت شو خوش و مکن نعمت یاد
شو تن در دہ کہ داد کس چرخ نداد

ہر بار بلائی کہ قضا بر تو نہاد
تن وار چو کوہ باش و بیباک چو باد [۲۳]

علامہ نے کہا ہے:

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیار ممکناتِ جسم و جان است [۲۴]

اور مسعود کے نزدیک مصائب و آلام، ہمت و استقامت کی تلوار کے جوہر نکھارنے اور اسے کاٹ دار بنانے کا سامان کرتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر بے وجہ و بے گناہ ٹوٹنے جانے والے دکھوں میں ہمت نہیں ہارتا۔ بُرد باری، صبر و استقامت اور دلیری سے انھیں برداشت کرتا ہے۔ وہ قید و بند میں نالہ وزاری تو کرتا ہے لیکن ایک رکھ رکھاؤ کے ساتھ جس میں صبر و سکون کا عنصر شامل ہے۔ ایسے عالم میں بھی اس کی سوچ اور فکر کا انداز مثبت ہے۔ اس تخریب میں بھی اسے اپنی تعمیر کے پہلو نظر آتے ہیں، جب وہ کہتا ہے کہ "میں ناشکرا کیوں بنوں۔ اس قید و بند نے میری طبع کے جوہر کو نکھارا ہے، بالکل اسی طرح

جس طرح چھیلنے سے تیر کے اور رگڑنے سے تلوار کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ مسعود بہت بڑا امیر اور صاحبِ مال و زر تھا لیکن اس قید نے اسے دانش ایسی دولت سے نوازا ہے، جس سے وہ پہلے بے بہرہ تھا۔"

غرض اس کے اس قسم کے تمام اشعار پڑھ جائیے، ہر جگہ اس کی بلند ہمتی، مردانگی اور عظمتِ کردار کا منہ بولتا ثبوت نظر آئے گا۔ نفسیاتی تجزیے کے بعد اس کا غالب سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عالی نسب اور فضل و دانش والے گھرانے کا ایک فرد تھا اور اس احساس کی بنا پر وہ کوئی بھی ایسی بات یا حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کی ذات پر کوئی دھبا آتا:[۲۵]

چرا ناسپاسی کنم زین حصار
چو در من بیفزود فرهنگ و هنگ

هنرهای طبعم پدیدار شد
تنم را ازین اندُه و آذرنگ

ز زخم و تراشیدن آید پدید
همی گوهرِ تیغ و نقشِ خدنگ[۲۶]

گرم نعمتی بود کاکنون نماند
کنون دانشی هست کانگه نبود[۲۷]

از فلک تنگ دل مشو مسعود
گر فراوان ترا بیازارد
به میندیش و سر چو سرو برآر
گر جهان بر سرت فرود آرد[۲۸]

قطعہ "خطاب بہ روزنِ زندان" میں بھی اس کا انداز خاصا رجائیت پسندانہ ہے۔ یہاں وہ کسی قسم کا شکوہ نہیں کرتا بلکہ اس روزن کو اپنی امید کی ایک ایسی آماجگاہ قرار دیتا ہے جس نے اس میں زندہ رہنے کا ولولہ پیدا کیا۔ اس چھوٹے سے قطعہ میں اس نے امید سے پُر جذبات کی دلکش انداز میں، جو زورِ بیان کا حامل ہے، عکاسی کی ہے۔ وہ قید خانے کے روشندان یا سوراخ کو اپنی آنکھوں کے لیے ایک نعمتِ جاوید سمجھتا ہے کیونکہ اسی کی بدولت اسے پتا چلتا ہے کہ اس وقت باہر

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

3698

رات ہے اور اس وقت دن۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اس کے لیے وہاں دن رات میں تمیز کرنا دشوار ہوتا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک معمولی سی کرن بھی انسان کے لیے کس قدر اہمیت کی حامل ہوتی ہے، اس کا اندازہ ایسے اندھیرے میں گھرا ہوا شخص ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ مسعود اسے مشتری و ناہید سے تشبیہ دے کر اپنے لیے سراسر سعادت و خوش بختی گردانتا ہے۔ زنداں میں جس کرب و اذیت سے وہ دوچار ہے اسے نہ تو وہ برملا ظاہر کرتا ہے اور نہ اس کا کوئی شکوہ۔ بلکہ قرآنی تلمیح کے حوالے سے اس کی توجیہ اور جواز ڈھونڈتا ہے جس میں اس کے کچھ نہ کہنے پر بھی، وہ سب کچھ آگیا ہے، جسے اسے تفصیل سے بیان کرنا پڑتا۔ کہتا ہے کہ:

"اگر تجھ میں مجھے کوئی بت (یا شیطان) نظر آتا ہے تو پھر کیا؟ بالکل صحیح ہے، اس لیے کہ تو حضرت سلیمانؑ کے تخت کی گذرگاہ جو ٹھہرا۔"

یہ مضمون مسعود ہی باندھ سکتا تھا۔ کسی دوسرے شاعر کے یہاں اس بلاغت کی مثال نظر نہیں آتی:

ای دلآرای روزنِ زنداں!
دیدگانرا نعیم جاویدی
بی محاق و کسوف بادی زانک
شب مرا ماہ و روز خورشیدی
ہمہ سعدم توئی از آنکہ مرا
فلکِ مشتری و ناہیدی
در ہمی دیو بینم از تو رواست
کہ گذرگاہ تختِ جمشیدی
بامیدِ تو زندہ ام گرنہ
مرمرا کشتہ بود نومیدی

: دیوان: ص ۶۳۲/۶۳۳

مسعود نے چند ایک رباعیات میں بھی اپنی عظمت و جرأت کے بیان کے لیے استعارات سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً اپنے بار بار قید ہونے کی توجیہ اس نے ایک رباعی میں یوں کی ہے کہ وہ ایک شیر ہے جسے یہ لوگ جنگلوں میں نہیں رہنے دینا چاہتے۔ یا پھر وہ ایک ہاتھی ہے جسے بھاری بھرکم زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے:

ہر یک چندی بقلعہ ای آرندم
اندر سبجی کنند و بسپارندم

سبجی: زیرِ زمین قید خانہ

شیرم کہ بدشت و بیشہ نگذارندم
پیلم کہ بزنجیرِ گراں دارندم

(دیوان: ص ۷۰۹)

اور اس رباعی میں بھی بات وہی کہی ہے لیکن لہجہ ذرا بدلا ہوا ہے، یعنی اس میں غم والم کی طرف بھی اشارہ آگیا ہے؛ لفظ "منم" میں نعرے کا لہجہ ہے اور نعرہ دلیر آدمی ہی لگایا کرتا ہے:

گنجی کہ ز پیش آں بجستند، منم
کوہی کہ بغم فرو شکستند، منم
پیلی کہ بہ زخمیش بخستند، منم
شیری کہ بہ بازیش ببستند، منم

: (ایضاً)

"جس خزانے کو اس سے قبل یہ لوگ تلاش کر رہے تھے وہ میں ہی ہوں۔ میں وہ پہاڑ ہوں جسے غموں نے کرچی کرچی کر دیا۔ میں وہ ہاتھی ہوں جسے زخموں سے چور کر دیا گیا اور میں ہی وہ شیر ہوں جسے کھیل ہی کھیل میں باندھ دیا گیا۔"

درج ذیل دو رباعیوں میں اس نے اپنی بخشش و سخاوت، خوش طبعی، قوتِ بازو اور جرأت و ہیبت کی عکاسی کی ہے، پہلی رباعی میں انداز سادہ اور دوسری میں وہی تشبیہ و استعارہ ہیں۔ پہلی رباعی کے چوتھے مصرعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چالندھر (حال بھارتی پنجاب) میں اس نے اپنی مردانگی و دلیری کے جھنڈے گاڑ دیے تھے:

از بخشش دست من زسیم و زر پرس
وز خوی خوشم ز مشک و از عنبر پرس
از قوتِ بازوی من از خنجر پرس
وز ہیبتِ من ز راہِ چالندھر پرس

کوہی کہ بر و بلا ببارند، منم
تیغی کہ بدست غم سپارند، منم
شیری کہ بروں نمی گذارند، منم
حواری کہ نکو نگاہ دارند، منم : (ارمغانِ پاک: ص ۱۰)

(وہ پہاڑ جس پر غم و الم کی بارش برسائی جاتی ہے، میں ہوں۔ وہ تلوار جسے غموں کے حوالے کیا جاتا ہے، میں ہوں۔ وہ شیر جسے باہر نہیں رہنے دیا جاتا، میں ہوں۔ اور وہ حواری جس کا خوب دھیان رکھا جاتا ہے، میں ہوں)۔

[اظہارِ عظمت کے سلسلے میں اس کا قطعہ:

چہ کین است با من فلک را بدل
کہ ہر روز یک غم کند نیستم

بھی لائقِ ملاحظہ ہے، بالخصوص یہ دو شعر جن میں سے ایک میں اس نے اپنی شاعرانہ برتری کی بھی بات کی ہے:

بہ معنی رکم بداں حاجت آید
سخن از ثریٰ بر ثریا رسانم
وگر بر براعت سواری نمایم
سپہر بریں برنتابد عنانم]

(دیوان: ص ۶۱۰)

جیسا کہ ملاحظہ ہوا، مسعود جہاں بھی اپنی دلیری و مردانگی کی بات کرنا چاہتا ہے وہاں وہ شیر کا استعارہ لاتا ہے اور اس کے ساتھ اکثر "آنم" یا "منم" کے الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس کے اظہارِ بیان میں زیادہ زور پیدا کرتے ہیں۔ اس رباعی میں اس نے اپنی بلند ہمتی، شیر مردی، سخت کوشی اور جنگ طلبی کی بات کی ہے:

ہر جائی کہ آتشِ نبردی ست منم
بر ہر طرفی کہ تیرہ گردیست منم
آں شیر کہ در صورت مردیست منم
پس چون کہ ہر جای دردیست منم

(بحوالہ "ماہِ نو")

اسی مشکل پسندی سے متعلق یہ رباعی بھی دیکھیے:

جز در غم عشق تو سفر می نکنم
جز بر سرِ کوہسار گذری نکنم
در عشقِ تو جز بجان خطر می نکنم
گر من زاغم (؟) چرا حذری نکنم

مردانگی و جنگجوئی کی ستائش میں اس کا ایک قطعہ ہے جو بڑا انوکھا اور خاصے زورِ بیان کا حامل ہے۔ اس کے آغاز میں وہ اس کی عمومی تعریف کرتا ہے اور آخر میں اپنے نیزے کے حوالے سے اپنی جنگجوئی کی زبردست عکاسی کرتا ہے۔ اس نے جس مؤثر اور مدلل انداز میں اپنے قاری کو درسِ مردانگی دیا ہے، فارسی کے کسی شاعر کے ہاں ایسا انداز نظر نہیں آتا بلکہ اس موضوع کو شاید ہی کسی نے چھیڑا ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ باتوں کا نہیں، حقیقت میں تلوار کا دھنی تھا اور یہی خوبی وہ اپنے بھائیوں، بالفاظِ دیگر، مسلمانوں میں بھی دیکھنے کا خواہاں تھا۔ یہ واضح ہے کہ موت سے کسی کو بھی اور کسی صورت چھٹکارا نہیں ہے۔ بزدل اور سست انسان کی موت اور ایک دلیر کی موت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے کہ دلیر انسان کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کی خاطر جان دیتا ہے اور بزدل انسان بے مقصد کی موت مر جاتا ہے۔ مسعود اس سے پوری طرح آگاہ ہے اور اپنے قاری کو بھی اس سے آگاہ کر کے اسے اس طرف لانا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے مردانگی سے ہاتھ نہ اٹھاؤ کہ سستی کی وجہ سے کبھی کوئی موت سے نہیں بچا۔ اس سلسلے میں وہ مچھلی کی مثال پیش کرتا ہے جو بلاشبہ نادر و بدیع بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ مچھلی اپنے کانٹوں کی بدولت پانی میں ادھر ادھر بھاگتی اور اچھلتی ہے لیکن کانٹا (جس سے مچھلی پکڑتے ہیں) ہی اسے باندھ کر خشکی پر لے آتا اور اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ مسعود کے نزدیک دلیر و جوانمرد کو موت کے ہاتھوں ذلت نہیں اٹھانا پڑتی۔ اور جس کسی نے لڑائی میں شرکت نہ کی ہو، لوگ اسے وقعت ہی نہیں دیتے۔ وہ سربلندی و سرفرازی کے سلسلے میں نیزے کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جنگ میں جس کسی نے دلیری کے جوہر دکھائے وہ نیزے کی طرح سربلند ہوا۔ وہ یہ بتانے کے لیے کہ موت کا ایک وقت معین ہے اس لیے اس سے ڈرنا گویا بار بار مرنے کے مترادف ہے، شدید جنگوں کی طرف (جنھیں وہ دوزخ قرار دیتا ہے) اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان میں بھی موت بعض کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ اس نے جنگوں میں اپنی شرکت کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جس طرح مردانہ وار بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے کی تصویر کشی کی ہے وہ اس کے قاری کو مبہوت کر کے رکھ دیتی ہے۔ ظاہر عجیب اور متضاد حیثیات کا مالک تھا۔ زبردست جنگجو، زبردست شاعر اور یہ صفات شاید ہی کسی میں یکجا ہوئی ہوں۔ اس کے ایسے اشعار سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ پہلے جنگجو تھا اور پھر شاعر، کیونکہ اگر وہ پہلے شاعر ہوتا تو شاید اس جوانمردی اور دلیری سے کسی قدر دور ہوتا۔

وہ عام لوگوں اور دلیروں کا موازنہ کر کے اپنے نیزے سے اپنی گفتگو کا ذکر چھیڑتا ہے۔ یہ موازنہ اور گفتگو، دونوں مضمون کے لحاظ سے اچھوتے اور اپنی مثال آپ ہیں اور اس کی شیر مردی اور اس کے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی غماز۔ وہ ڈرنے والوں کے دل کو بچے کے دل سے تشبیہ دیتا ہے جو چھوٹی سی چیز سے بھی خوفزدہ ہو جاتا ہے جبکہ صاحبِ قتال حملے کے وقت مستی میں جھوم رہا ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ جب میں نے حملے کے لیے نیزہ اٹھانا چاہا تو وہ میرے ہاتھ میں ایسی صورت اختیار کر گیا جیسے بل کھایا ہوا سانپ ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ اے شاخِ مرگ! ذرا سیدھی ہو جا۔ میں تجھ سے بہت سے دل زخمی کرنے والا ہوں۔ وہ اپنے نیزے کو بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ اس سے اسے خون پینے کو ملے گا اور اس طرح

وہ خوشی سے لہرا اٹھے گا، بصورتِ دیگر ٹوٹ جانے کا خوف اسے لرزائے رکھے گا۔

تا توانی مکش زمردی دست
کہ بسستی کسی زمرگ نجست
ہر کہ او را بلند مردی کرد
تا بروز اجل نگردد پست
ہر کہ با جان نایستاد برزم
دان کہ در پیشگہ بحق نشست
سرفرازد چو نیزہ ہر مردی
کہ میان جنگ را چو نیزہ ببست
ای بسا رزمگاہ چوں دوزخ!
کہ قضا اندرو درست برست
دلِ مرداں ز ترس چوں دل طفل
سرِ گرداں ز حملہ چوں سرِ مست

(دیوانِ مسعود: ص ۶۴)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ مسعود قوت اور دلیری و جوانمردی کو کس قدر اہمیت و وقعت دیتا ہے۔ جب ہم حضرتِ علامہ کے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں اس وقعت و اہمیت کا واضح سبب مل جاتا ہے۔ علامہ 'ضربِ کلیم' کی ایک نظم 'جلال و جمال' (صفحہ ۱۲۲) میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

یعنی تسخیرِ کائنات کی خاطر اور دنیا میں بدی کی قوتوں کے استیصال کے لیے قوت و قدرت لازمی ہے۔

مسعود نے نیزے کی بات کی ہے، اقبال شمشیر کی بات کرتے ہیں۔ اگرچہ انداز دونوں کا الگ الگ ہے تاہم مفہوم اور نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔

نظم "آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر" میں فرماتے ہیں:

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار

اس بیت کا یہ مصرع اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالدِ جانباز ہے یا حیدرِ کرار

(بالِ جبریل: ص ۲۱)

گویا قوت و جبروت کی یہ علامت (تلوار) علامہ کے شعور پر چھائی ہوئی ہے۔ مسعود نے بعض قصائد میں ممدوح کی مدح کے ساتھ ساتھ اپنے جس بے جا کا بھی گلہ شکوہ کیا ہے؛ لیکن ایسے مواقع پر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے شکوہ کرتے کرتے اسے ایک دم اپنی عزتِ نفس، خودداری اور بلند حوصلگی کا خیال آ گیا ہے۔ لہٰذا وہ ان آلام و مصائب کو کوئی وقعت نہ دیتے ہوئے خیالات کا رُخ کسی مثبت پہلو کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس کے ایسے اشعار میں ایک خاص طنطنہ، ولولہ اور جوش ہے۔ یہاں مثال کے طور پر رئیس ابوالفتح بن عدیل کی مدح میں کہے گئے ایک قصیدے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے آغاز میں وہ اپنی اذیتوں اور مصیبتوں کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے کہ کب تک میرا دل حوادث کے تیر سے چھلنی ہوتا رہے گا اور کب تک زمانے کے ظلم و ستم سہہ سہہ کے میری بری حالت ہوتی رہے گی۔ وہ اپنے آپ کو ایسا شکار اور قتیل قرار دیتا ہے جس سے پہلے قضا و قدر کسی کو ایسا شکار و قتیل نہیں کر سکی۔ پھر وہ اپنی انتہائی بدنصیبی کو استعارے کی زبان سے ادا کرتے کرتے یکدم کروٹ لیتا اور جیسے پُرعزم انداز اور دبدبہ کے ساتھ اپنے ان خیالات کا رد کرنے لگتا ہے۔ کہتا ہے:

"نہیں نہیں! اس رنج و محن میں تو مجھے وہ کچھ نصیب ہوا ہے جو سراسر سعادت ہی سعادت ہے۔ میری ذات تو ایسی ہے کہ زمانہ کبھی مجھ کمزور نہیں پائے گا اور نہ کبھی چشمِ فلک مجھے بحالتِ ذلت دیکھے گی۔ اس لیے (اے مخاطب) تو مجھے حقارت و نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھ، ہر چند میں اس وقت بھاری بھرکم بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں؛"

تا کی دلم ز تیرِ حوادث شود جریح
تا کی تنم ز جورِ زمانہ بود علیل

ہرگز چو من نگیرد چنگ قضا شکار
ہرگز چو من نیابد تیرِ قدر قتیل
یک چشم در سعادت نگشاد بختِ من
کش در زماں نہ دستِ قضا در کشید میل
زنہ بمحنت اندرم آں حالِ تازہ شد
کاں سوی ہر سعادت و دولت بود دلیل
آنم کہ دستِ دہر نیابد مرا ضعیف
آنم کہ چشمِ چرخ نبیند مرا ذلیل
ہرگز بچشمِ خفت در من مکن نگاہ
ورچند بر ود پایم بندیست بس ثقیل[29]

کسی کی مدح و تعریف میں بھی، جو اس نے کسی قدر شناسی یا ضرورت کے تحت کی ہے، وہ اپنی عزتِ نفس پر آنچ نہیں آنے دیتا اور کڑے سے کڑے وقت میں بھی کسی کا زیرِ بار احسان نہیں ہونا چاہتا۔ ذیل کے اشعار اس کی اس بلند طبعی کے زبردست عکاس ہیں۔ ان میں بھی اس نے استعارات و تشبیہات کی زبان میں اپنے دکھوں اور بدنصیبی کی بات کر کے اس امر کا اعلان کیا ہے کہ میں صاحبِ عظمت ہوں، کسی صورت بھی کمینوں کے آگے سر نہ جھکاؤں گا۔ چونکہ اس نے خدائے ذوالمنن کا دامن تھام رکھا ہے اس لیے وہ کسی کا احسان نہ اٹھائے گا۔ ذرا اس کا دعویٰ بلکہ عزم ملاحظہ ہو کہ کمینہ لوگوں کا احسان اٹھانا تو ایک طرف) اگر میری آنکھوں نے سورج سے بھی روشنی مانگی تو میں انھیں پھوڑ ڈالوں گا:

تخم گشت ای عجب مگر سخنم
کہ پراگندہ بر زمین نگنم
او بروید ہمی و شاخ زند
من ازو دانۂ ہمی نچشم
آفتابست ہمتم گرچہ
منحنی گشت ہمچو سایہ تنم
بار گشتہ ست پوست بر تنِ من
چوں توانم کشید بیہدہ منم[30]

هر زمانی بدستِ صبر ہمی
گردن آرزو فرو شکنم

ہمہ آتشکدہ شدست دلم
من ازآن بیم دم ہمی نزنم

کہ زتفِ دل اژدہا کردار
پر ز آتش ہمی شود دہنم

سر بہ پیشِ خسان فرو نارم
کہ من از کبر سرو بر چمنم

منتِ ہیچ کس نخواہم از آنک
بندۂ کردگار ذوالمننم

گر ز خورشید روشنی خواہد
دیدگان را ز بیخ و بن بکنم [۳۱]

ایک رباعی میں اپنی خودداری اور عزتِ نفس کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ:

"اگر میں خلد میں جاؤں تو حور العین کو میری نازبرداری کرنا ہوگی اور اگر داروغۂ جنت میرے سامنے مؤدب ہو کر نہ آئے تو میں اس سے منہ پھیر کر دوزخ کا رخ کر لوں گا۔"

جس قدر شانِ بے نیازی، طنطنہ اور ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ مسعود کے یہاں ملتا ہے، فارسی کے دیگر شعرا میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ لفظ "آنم" ایک زبردست لہجے اور دبدبے کا لفظ ہے اور مسعود اسے اکثر استعمال کرتا ہے:

آنم کہ اگر بخلد جائی سازم
حور العین را کشید باید نازم

رضوان سبک ار پیش نیاید بازم
بر تابم روی و سوی دوزخ تازم [۳۲]

یہ قطعہ بھی ملاحظہ ہو جس میں اس نے بہرحال اپنی زبردست ثابت قدمی اور قدر و عظمت کا اظہار کر کے، بظاہر خود کو، لیکن دراصل اپنے قاری کو ہر حال میں ڈٹ کر رہنے کی تلقین کی ہے؛ کہتا ہے:

"اگر آسمان چکی کی طرح میرے گرد گھومتا رہے میں، اس سے بے نیاز، قطب کی طرح اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ٹلوں گا۔ میں زمانے کے ہاتھ میں وہ اصیل تلوار ہوں، جسے آخرکار یہ

لوگ روزِ جنگ باہر لانے پر مجبور ہوں گے۔ زمانے کے ہر گرم و سرد کے سامنے خود رَو خس و خاشاک کی طرح نہ رہ (کہ ذرا سی ہوا سے اکھڑ کے رہ جائے) بلکہ ہر صورت اور ہر حال میں سرو کی طرح تن کر رہ"۔

مسعود اس لحاظ سے واحد شاعر ہے[۴۳] جس کے زندگی کے تجربات و مشاہدات دیگر شعراء سے بہت ہٹ کر ہیں۔ اس کے بیشتر اشعار اس کی آپ بیتی ہیں۔ اور ان میں درد اور تاثیر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اندازِ بیاں اور اس کے معانی و مطالب میں بھی اس کی انفرادیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے:

گر گردِ من بگردد چوں آسیا فلک
از جای خود نجنبم چوں قطب آسیا
آں گوہری حسامم در دستِ روزگار
کاخر بروںنم آرد یک روز در وغا
خود رَو چو خس مباش بہر سرد گرم دہر
آزادہ سرو باش بہر شدت و رخا[۴۴]

(۵)

شاہین، علامہ اقبال کا ایک پسندیدہ پرندہ ہے۔ ان کے یہاں یہ پرندہ درویشی، بہادری اور آزادی پسندی کی علامت ہے۔ اسی باعث حضرت علامہ نے اپنے کلام میں جگہ جگہ اس کی ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے[۴۵]۔ مسعود نے اگرچہ اسے علامت کے طور پر تو استعمال نہیں کیا تاہم اس کی دلیری اور بے ضرری کا ذکر اسی انداز میں کیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مسعود پہلا شاعر ہے جس نے اس انداز سے اس پرندے کی طرف توجہ کی۔ بادشاہ کے ایک شاہین کی تعریف کے آخر میں اس کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ واقعی ایک مردِ مومن کی تصویر بنتی ہے۔ وہ حملہ کرتے وقت شیر کی طرح ٹھلتا ہے۔ گو بھی کے پتوں اور شلغم پر گزارہ کرتا ہے۔ مردانگی کی بنا پر سر بلند رکھتا ہے اور اسی مردانگی کے پیشِ نظر کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ معلوم ہوتا ہے حضرت علامہ کی نظر سے مسعود کا یہ قطعہ نہیں گزرا ورنہ وہ ضرور اسے اپنے کلام میں بھی جگہ دیتے اور مسعود کی تعریف میں بھی بہت کچھ کہتے:

حملہ آور چو شیر گر انزد
سیل خونیں ز کف بیند ازد

او ز برگ کلم گذاره کند
شلغم پاره را دو پاره کند

آخر او بر کشد بمردی سر
بکند کس زبان بمردی بر

(۶)

مسعود کے یہاں اخلاقی درس بھی ہے جو اس کے اپنے صفائے باطن اور پاک فطرتی سے متعلق دعووں کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا درس صرف وہی شخص دے سکتا ہے جو خود بھی ان صفات سے آراستہ ہو۔ اس کے دوسرے کلام کے مطالعے سے یہ بات اجاگر ہوتی ہے کہ وہ فطری طور پر ان صفات کا حامل انسان تھا اور بلاجواز کے قید و بند کی صعوبتوں نے اس کی ان خوبیوں کو ماند نہیں پڑنے دیا بلکہ ان کے لیے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ ذیل کے قطعہ میں اس نے جو اندازِ درس اختیار کیا ہے وہ کچھ اس ڈھب کا ہے کہ اگر پہلے سے یہ نہ بتا دیا جائے کہ یہ مسعود کا قطعہ ہے تو فارسی ادب کا کوئی بھی قاری اسے بآسانی سعدی شیرازیؒ سے منسوب کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں مسعود کی صورت میں سعدی بول رہا ہے۔

اس قطعہ میں شکر کرنے، راستی و راست گوئی، سخاوت، دوسروں کے ساتھ نیکی، بدی سے دوری اور بیدار باشی کا درس ہے۔ اندازِ بیاں میں خلوص و تاثیر ہے اور تصنع یا تکلف نام کو نہیں:

ایمنی را و تندرستی را
آدمی شکر کرد نتواند

در جہاں این دو نعمتی ست بزرگ
داند آں کس کہ نیک و بد داند

تا فراواں نایستی تو ذلیل
روزگارت عزیز ننشاند

آنچہ بدہد فلک ترا لستان
باز دہ بیش از آن کہ بستاند

راستی کن ہمہ کہ در دو جہان
بجز از راستیت نرہاند

Iqbal Cyber Library All rights reserved. ©2002-2006

سخت بیدار باش در ہمہ کار
پیش ازاں کت قضا بجنباند

نیک رَو، بد مرو کہ نیک و بدست
کز شما یادگار می ماند[۳۷]

اکثر شعرا نے بولتے وقت زبان کو قابو میں رکھنے کا درس دیا ہے لیکن مسعود نے یہاں اس قطعہ میں تحریر کے سلسلے میں بھی محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔ سادہ اور عام مستعمل تشبیہات و استعارات سے کام لیتے ہوئے اس نے اپنی بات میں زور اور تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مطابق لکھنا، بولنے سے کہیں زیادہ اہم ہے، اس لیے ایسے موقع پر (لکھتے وقت) بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ قلم جس طرح خود سیدھا ہے اسی طرح اس سے جو بات لکھی جائے وہ بھی راست ہونی چاہیے یعنی نیک اور بد میں تمیز لازم ہے۔ وہ قلم کی دو نوکوں کو زہر اور شہد کی حامل قرار دے کر صرف شہد سے کام لینے اور زہر سے بچنے کا درس دیتا ہے۔ گفتگو کے دوران اگر کسی کے منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل جائے تو اس کی صرف گوشمالی ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے لیکن تحریر میں ایسی بات سر قلم ہو جانے کا باعث بنتی ہے:

بنشتن ز گفتن مہم تر شناس
بگاہ نوشتن بجا آر ہوش

سخن با قلم چوں قلم راست دار
بنیک و بَد در سخن نیک کوش

دو نوکِ قلم را مدان جز دو چیز
یکی صرف زہر و یکی محض نوش

تو از نوشِ او زندگانی ستان
ز زہرش مکن جانِ شیرین بجوش

بگفتن ترا گر خطایی فتد
ز بر بط فرو نت بمالند گوش

و گر در بنشتن خطایی کنی
سرت چوں قلم دور مانند زدوش[۳۸]

گزرے ہوئے لوگوں کے کاموں اور کارناموں سے استفادہ کرنے اور آنے والوں کے استفادے کے لیے کچھ چھوڑ جانے کا درس، اور خوش و خوش زندگی بسر کرنے کی تلقین:

از درختانِ دیگراں برچین
وز پی دیگراں درخت نشان
در بنا ہای مردماں بنشین
داد شادی و خرمی بستان
از پسِ تو نشستِ خلق شود
ایں ہمہ خانہ و ہمہ بستان[۳۹]

ایک قطعہ میں دنیا کی بے ثباتی اور اس میں دولت و اقتدار کے عارضی و فانی ہونے کی بات کرنے سے پہلے نیک فطرتی اور بخشش و کرم ایسی صفات پیدا کرنے کا درس دیتا ہے۔ یہ انداز اس نے شاید اس لیے اختیار کیا ہے کہ اصل بات (بخشش و کرم وغیرہ) میں زور اور تاثیر پیدا ہو:

خدمت خر کہ روز اقبال است
مکرمت کن کہ روزِ امکان است
نہ ہمہ سال کار ہموار است
نہ بہر وقت حال یکسان است
بر جہاں چند نوع نیرنگ است
بر ملک چند گونہ احزان است
پُرجفا چرخ پُر ز پیکار است
بیوفا دہر سست پیمان است[۴۰]

ایک رباعی میں خواہ مخواہ سوچ بچار میں پڑے رہنے سے منع کیا ہے کیونکہ اس سے کوئی مسئلہ حل ہونے کے بجائے اور الجھ جاتا ہے۔ جو مسئلہ آسانی سے حل ہو سکے وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر مشکل ہو تو کسی تجربہ کار سے مشورہ لینے میں حرج نہیں:

اندیشہ مکن بکارہا در بسیار
کاندیشۂ بسیار بپیچاند کار
کاری کہ برایت آید آساں بگذار
ور نتوانی بکار دانان بسپار[۴۱]

آخر میں اس کی ایک عشقیہ رباعی ملاحظہ ہو جس کی صدائے بازگشت غالب کے اس شعر میں سنائی دے رہی ہے:

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں!

مسعود کی رباعی:

آنرا کہ تو در دلی خرد در سر اوست
وآن راکہ تو رہبری فلک چاکر اوست
آن راکہ بہ بالینِ تو یک شب سر اوست
سر ودگل و مہر و ماہ در بستر اوست [۴۲]

راقم نے کلامِ مسعود کے فنی محاسن و معایب کی کم ہی بات کی ہے۔ دراصل راقم کا مقصد حضرت علامہ کے حوالے سے مسعود کا مطالعہ کرنا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اپنی سی کوشش کی ہے کہ زیادہ تر اس کے کلام کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے جو علامہ کے مزاج کے قریب ہیں اور جن سے علامہ متاثر ہوئے یا ہو سکتے تھے۔

لالہ این چمن آلودہ رنگ است ہنوز
سپر از دست مینداز کہ جنگ است ہنوز

Iqbal Cyber Library .net All rights reserved. 2002-2006 اقبال سائبر لائبریری

کتابیات

۱۔ دیوان مسعودِ سعدِ سلمان ۔ بتصحیح آقای رشید یاسمی ۔ طہران ۱۳۱۸ش

۲۔ تاریخ ادبیات درایران ۔ تالیف دکتر ذبیح اللہ صفا، جلد دوم ۔ تہران ۱۳۳۶ش

۳۔ تاریخ ادبیات ایران ۔ تالیف دکتر رضازادہ شفق ۔ تہران ۱۳۴۲ش

۴۔ تاریخ ادبیات ایران وتاریخ شعرا ۔ تالیف حسین فریور، تہران

۵۔ چہار مقالۂ عروضی ۔ تالیف احمد بن عمر بن علی النظامی العروضی السمرقندی ازروی نسخۂ تصحیح شدۂ مرحوم محمد قزوینی چاپ اقبال ۔ تہران ۱۳۳۹ش

۶۔ خلاصۂ شاہنامہ ..... بانتخاب ..... میرزا محمد علی خان فروغی ... طہران ۱۳۱۳ش

۷۔ ارمغانِ پاک ۔ تالیف شیخ محمد اکرام، بامقدمۂ استاد نفیسی، تہران ۔ ۱۳۳۳ش

۸۔ دیوانِ عمید لویکی ۔ مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، چاپ مجلس ترقی ادب لاہور جنوری ۱۹۸۵ء

۹۔ پیامِ مشرق ۔ اقبال، طبع ہفتم ۱۹۴۸ء لاہور

۱۰۔ بالِ جبریل ۔ اقبال لاہور

۱۱۔ دیوانِ غالب ۔ مطبوعہ تاج کمپنی لاہور

۱۲۔ فرہنگِ عمید ۔ تالیف حسن عمید، تہران ۱۳۴۰ش

۱۳۔ مجلہ ماہِ نو ۔ (اقبال نمبر) کراچی ۔ اپریل ۱۹۷۰ء

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2009

حواشی

۱۔ یہ رباعی دیوان مسعود سعد مرتبہ رشید یاسمی مرحوم (تہران) میں نہیں ہے البتہ اس سے ملتی جلتی ایک رباعی اس طرح ہے:

من ہمت باز دارم و کبر پلنگ
زانروی مرا نشست کوہ آمد و تنگ

روزی دو سہ گردہم چرخ درنگ
بر پر تذرو غلطم و بر سینۂ رنگ (رنگ: پہاڑی بکرا)

اور متن میں دی گئی رباعی "تاریخ ادبیات در ایران" ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا (تہران) جلد ۲، ص ۱۰۵ سے لی گئی ہے۔

۲۔ علامہ نے شعری ضرورت کی خاطر مسعود کے بجائے اس کے دادا سلمان کا نام لیا ہے۔ بہرحال یہاں ان کی مراد مسعود ہی سے ہے۔ جیسا کہ انھوں نے حاشیے میں خود واضح کر دیا ہے۔

۳۔ بالِ جبریل ص ۱۰۹

۴۔ اس کے حالات کے لیے ان کتب سے استفادہ کیا گیا: دیوانِ مسعود سعد سلمان مرتبہ رشید یاسمی، مطبوعہ تہران ــــ تاریخِ ادبیات در ایران، از دکتر ذبیح اللہ صفا۔ جلد ۲، مطبوعہ تہران ــــ تاریخ ادبیات ایران، از دکتر رضا زادہ شفق مطبوعہ تہران ــــ تاریخ ادبیات ایران و تاریخ شعرا از حسین فریور، مطبوعہ تہران۔

۵۔ لاہور سے اپنے تعلق کا اظہار اس نے کئی جگہ کیا ہے مثلاً ایک جگہ لاہور سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

ای لاہور ویحک بی من چگونہ ای
بی آفتاب روشن، روشن چگونہ ای
ناگہ عزیز فرزند از تو جدا شدہ است
با دردِ او بنوحہ و شیون چگونہ ای

ــــ

محملی باید از خداوندم کہ ازو بوی بود ہور آید

که همی ز آرزوی لوہاور جان و دل در تنم ہمی پاید

بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق شعر ذیل بھی لاہور ہی کے بارے میں ہے:

بہیچ نوع گناہی دگر نمی دانم
مرا جز اینکہ دریں شہر مولد و منشاست

۶۔ دیوان مسعود سعد۔ ص ۵۶

۷۔ چہار مقالہ، چاپ اقبال۔ ص ۷۵ (تہران)

۸۔ دیوان مسعود سعد سلمان۔ ص ۶۰۱

۹۔ ارمغانِ پاک۔ ص ۱۰

۱۰۔ دیوانِ غالب۔ ص ۱۸۱

۱۱۔ " ص ۱۹۳

۱۲۔ دیوان مسعود سعد سلمان ص ۵۹۸

۱۳۔ تاریخ ادبیات در ایران۔ تالیف ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا۔ جلد دوم: ص ۴۹۲-۴۹۳

۱۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "خلاصہ شاہنامہ"۔ ص ۲۴۸ بعد

۱۵۔ صفا۔ جلد دوم ص ۴۹۳

۱۶۔ فرہنگِ عمید۔ تالیف حسن عمید۔ تحت کلمہ غزو

۱۷۔ یہاں حضرت علامہ کا یہ شعر بھی قابلِ توجہ ہے:

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی (بالِ جبریل: ۶۱)

۱۸۔ دیوان مسعود سعد سلمان ص ۶۲۔ اس کا یہ شعر بھی لائقِ ملاحظہ ہے:

اگر بخندد در دست من قدح نہ عجب
کہ بس گریست فراواں بدستِ من شمشیر

۱۹۔ صفا جلد دوم ص ۴۹۶

۲۰۔ ارمغانِ پاک۔ ص ۱۷-۱۸

۲۱۔ صفا۔ جلد دوم ص ۴۹۶-۴۹۷

۲۲۔ پیامِ مشرق۔ ص ۱۴۳

۲۳۔ دیوانِ مسعود سعد۔ ص ۶۹۸

۲۴۔ پیامِ مشرق۔ ص ۱۴۴

۲۵۔ مسعود کو اپنی عالی نسبی کا بھرپور احساس ہے جس کا اس نے کئی جگہ ذکر کیا ہے مثلاً:

از بخت ہمیشہ سر نگونم
زیرا کہ چو دیگراں نہ دُونم

اور اسی قطعے کا آخری شعر بھی اسی امر کی غمازی کرتا ہے:

شکرِ ایزد را کہ اندریں حبس
از دیدنِ سفلگاں مصونم

——— (دیوان، ص ۶۰۸-۶۰۹)

۲۶-۲۷۔ ماہِ نو، اقبال نمبر، کراچی اپریل ۱۹۷۰ء ص ۲۲۵

۲۸۔ دیوان مسعود سعد ص ۱۰۶

۲۹۔ بحوالہ ماہِ نو، اپریل ۱۹۷۰ء ص ۲۲۵

۳۰۔ ضعف و ناتوانی سے متعلق یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

شد تنِ من چنانکہ گر خواہد
مگس آسان ز جای برباید (دیوان: ص ۵۹۲)

۳۱۔ بحوالہ ماہِ نو

۳۲۔ 〃

۳۳۔ برصغیر پاک و ہند کے ایک مشہور شاعر عمید لویکی (وفات پس از ۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء) کے حبسیات بھی اب سامنے آگئے ہیں لیکن ان میں وہ تاثیر نہیں جو مسعود کے ایسے کلام میں ہے۔ ممکن ہے عمید تھوڑا عرصہ قید میں رہا ہو۔ اس وجہ سے اسے ان حالات و حادثات کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو جن سے مسعود کو گزرنا پڑا۔ (مرتب دیوان عمید نے اس کے محبوس ہونے کا ذکر نہیں کیا البتہ اس کے ایک آدھ قصیدے سے اس کا پتہ چلتا ہے)۔ عمید اس حالتِ حبس میں بھی فنی چابکدستیوں کے اظہار میں مصروف نظر آتا ہے۔ عمید کا تعلق سلطان ناصر الدین محمود (م ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء) اور سلطان غیاث الدین بلبن (م ۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء) کے درباروں سے رہا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی (بھارت) کے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اس کا دیوان ترتیب دیا ہے جسے مجلس ترقی ادب لاہور (پاکستان) نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ عمید کے حبسیہ اشعار کے لیے ملاحظہ ہو دیوانِ مذکور ص ۹۹ ببعد۔ البتہ خاقانی شروانی (۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء)

کے یہاں بھی چند جھلیات موجود ہیں جنھیں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے "چند قصیدۂ جیسہ زیبای او ....." کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ خاقانی کو بقول صفا ایک برس تک محبوس رہنا پڑا (تاریخ ادبیات در ایران۔ جلد دوم۔ ص ۷۸۰)۔ اس ضمن میں اس کا یہ قصیدہ بڑی شہرت رکھتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا ایک ایک شعر روح کو تڑپانے والا ہے؛ اس میں درد اور تڑپ کے علاوہ فنی چابکدستی اور استادانہ مہارت بھی ہے۔ زورِ بیان نے قصیدے میں ایک عجیب دلکشی اور تاثیر پیدا کر دی ہے:

صبحدم چون کله بندد آه دود آسای من
چون شفق در خون نشیند چشم شب پیمای من

دو ایک شعر اور ملاحظہ ہوں:

مار دیدی در گیاه پیچان، کنون در غاریه غم
مار بین پیچیده بر ساق گیا آسای من
اژدها بین حلقه گشته خفته زیر دامنم
ز آن نجنبم ترسم آگه گردد اژدرهای من
روی خاک آلود من چون کاه بر دیوار حبس
از رخم کهگل کند اشک زمین اندای من
غصه هر روز و "یارب یارب" هر نیم شب
تا چه خواهد کرد "یارب یارب" شبهای من

صفا۔ جلد ۲، ص ۷۸۶-۷۸۷

۲۴۔ ارمغانِ پاک۔ ص ۱۱

۲۵۔ اس سلسلے میں صرف بالِ جبریل سے دو تین اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی (ص ۲۱)

نظم "نصیحت" (ص ۱۶۲)۔ پھر "شاہین" (ص ۲۱۸) بھی لائقِ ملاحظہ ہیں۔ "شاہین" کے دو شعر:

حمام و کبوتر کا بھوگا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ (ص ۲۱۹)

۳۶۔ بحوالہ ماہِ نو

۳۷۔ دیوانِ مسعود سعد: ص ۵۸۸۔۵۸۹

۳۸۔ 〃 〃 : ص ۶۰۴۔۶۰۵

۳۹۔ ارمغانِ پاک : ص ۱۲۔۱۳

۴۰۔ 〃 〃 : ص ۱۳

۴۱۔ صفا۔ جلد دوم : ص ۵۰۱

۴۲۔ 〃 〃

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002

من از طریق نیرسم رفیق می جویم
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و بازطریق

ےک

چیست روباهی؟ تلاشِ ساز و برگ
شیرِ مولا جوید آزادی و مرگ!

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006